E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A (1st) Islamic Studies

Paper : II / ULOOM E ISLAMIA

Module Name/Title : Imaam Ghazali

DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE
PRESENTATION	Dr Sanaullah Nadvi, Dr Fahim Akhtar
PRODUCER	Mr. Md Mujahid Ali

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

اللہ تمھاری صورتوں کو نہیں تمھارے قلوب کو دیکھتا ہے، اگر کوئی بندہ کسی خراب جگہ میں ہو اور اس کا دل اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو تو یہ اس سے بہتر یہ کہ وہ مکے اور مدینے میں ہو اور اس کا دل غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ سالک کو تکبر اور گھمنڈ سے بچنا چاہیے۔ علم اگر کسی بچے سے بھی حاصل ہو تو اسے حاصل کرنا چاہیے۔ سالک کو اپنے نفس سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ مخلوق کی پسند کا خیال نہیں کرنا چاہیے، اللہ کی پسند کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ مخلوق کو معتقد بنانے میں اس کے دھوکے سے بچو، خلوت اختیار کرو، چونکہ دین کی حقیقت خلوت میں روشن ہوتی ہے۔ کسی کو شیخ بناؤ تو خوب غور وفکر اور مشورے، مشاہدے اور استخارہ اور دعا کے بعد پیر بناؤ، اگر خود پیر ہو جاؤ تو لوگوں کی صلاحیت اور استعداد کے موافق وصیت کرو۔ تقویٰ کی ابتداء سے دل ہوتی ہے پہلے اپنے اعضاء و جوارح کو شریعت کی منع کردہ اشیاء سے باز رکھو، یہ عمل رفتہ رفتہ ظاہر سے باطن کی طرف جائے گا اور پھر باطن بھی تقویٰ کا عادی ہو جائے گا۔

حضرت نے اپنی کتاب عوارف المعارف میں لکھا ہے کہ سالکین کی چار قسمیں ہیں:

سالک، مجذوب، سالک مجذوب اور مجذوب سالک۔ ان میں سالک میں چونکہ نفسانی صفات موجود رہتی ہیں اور حجابات نہیں ہٹائے جاتے اس لیے وہ شیخ بنانے کے لائق نہیں ہوتا، مجذوب سے حجابات تو ہٹا لیے جاتے ہیں سلوک طے نہیں ہوتا، اس لیے وہ بھی شیخ بنائے جانے کے قابل نہیں۔ بقیہ دونوں ایسے ہیں جنھوں نے سلوک بھی طے کر لیا اور حجابات بھی ان سے اٹھا لیے گئے اس لیے شیخ بنانے کے لائق ہیں۔

شیخ نے ان لوگوں پر بھی سخت تنقید کی ہے جو تکلیف شرعی کے اٹھا لیے جانے کی بات کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں شریعت حق عبدیت ہے اور راہ سلوک میں حقیقت کا مطلب دراصل عبودیت ہی ہے۔ شیخ کی نظر میں علم سے عمل آتا ہے اور عمل سے معرفت حاصل ہوتی اور معرفت سے ہدایت ملتی ہے۔

21.14 ابو حامد غزالی (1058-1111ء)

امام ابو حامد الغزالی پانچویں صدی کی سب سے عظیم شخصیت اور مجدد دین وملت ہیں، ان کا دائرہ تجدید کسی ایک پہلو میں محدود نہیں ہے، وہ فقہ وفتویٰ کے عظیم امام تھے، فقہ شافعی کی تاریخ اور اصول فقہ کی فہرست ان کے کارناموں کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے، فلسفہ کے وہ سب سے بڑے امام اور ناقد تھے، انہوں نے مقاصد الفلاسفہ میں فلسفیانہ علوم یا تہافۃ الفلاسفہ میں فلسفہ پر تنقید اور معیار العلم میں ذرائع علم پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے، اور پہلی دفعہ یونانی فلسفہ کا خود انہی کے اصولوں کی روشنی میں نقد و تجزیہ کیا ہے، اور اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے احیاء العلوم کے ذریعہ تمام اسلامی علوم کا بے مثال محاکمہ کیا ہے، مشکوۃ الانوار جیسی کتابوں کے ذریعہ تصوف کے غوامض کی عقدہ کشائی کی ہے، نصیحۃ الملوک کے ذریعہ انہوں نے علم سیاست کی گتھیوں کو سلجھایا ہے، انہوں نے یونانی فلسفہ اور مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والے باطنی افکار و نظریات پر زبردست تنقید کر کے اسلامی عقائد اور ایمان کو از سر نو تازہ کیا ہے۔ اپنے دور کے پس منظر میں اسلامی عقائد کی اطمینان بخش تعبیر کی، اخلاق، اعمال اور اجتماعی زندگی اور نظام سیاست کا تفصیلی جائزہ لیا اور شریعت اسلامی کی تشکیل از سر نو کی۔

IMC LIBRARY

امام غزالی کا پورا نام محمد بن محمد بن احمد تھا، کنیت ابو حامد اور نسبت غزالی تھی۔ ابو حامد الغزالی کے نام سے دنیائے علم و ادب میں لازوال شہرت پائی، ان کی نسبت کے بارے میں اختلاف ہے، اکثر تذکرہ نگار اس کو پیشہ کی طرف نسبت قرار دیتے ہیں، امام غزالی کے والد سوت کاتنے کا کام کرتے تھے، سوت کاتنے کو عربی میں غزل کہتے ہیں، اس میں یائے نسبت لگا کر اس کو الغزالی بنا دیا۔ بعض دوسرے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ غزالہ ایک گاؤں کا نام ہے۔

امام غزالی کی ولادت خراسان کے شہر طوس کے مضافات میں ایک گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے، لیکن ان کو علم کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت دلانے کے لیے کچھ رقم بھی پس انداز کرنی شروع کی تھی؛ لیکن ان کی عمر کا پیمانہ جلد ہی لبریز ہوگیا، دم واپسیں کا احساس ہوا تو بچوں کو تعلیم دلانے کی حسرت تکمیل آرزو کے نئے سامان ڈھونڈنے لگی، آخر ایک قابل اعتماد دوست کو بلایا، عمر بھر کی پس انداز کی ہوئی رقم اس کے حوالے کی اور بچوں کو ان کی سرپرستی میں دے کر وصیت کی کہ ان کی تعلیم اب آپ کے ذمہ ہے، چنانچہ پھر امام غزالی اور ان کے چھوٹے بھائی احمد الغزالی کی تعلیم و تربیت ان کی نگرانی میں ہوئی۔

امام غزالی نے ابتدائی تعلیم طوس میں حاصل کی، پھر مزید تعلیم کے لیے نیشاپور کا رخ کیا، نیشاپور اس زمانے میں اسلام کی علمی روایت کا اصلی امین تھا، وہاں اس وقت بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود تھے، امام ابوالقاسم القشیری اور ابوعلی رودباری جیسے عظیم المرتبت صوفیہ وہاں تھے، اور امام الحرمین جوینی جیسے متکلم بھی وہیں تھے، امام غزالی امام الحرمین کی صحبت میں رہے، امام غزالی پر امام الحرمین کو بھی بڑا ناز تھا، امام الحرمین کی صحبت میں ایک طویل مدت رہ کر امام غزالی نے مختلف علوم کی تکمیل کی، ان کی وفات کے بعد امام غزالی نے بغداد کا رخ کیا، اب امام غزالی کی عمر تقریباً 30 سال ہو چکی تھی، اور مختلف علوم وفنون میں ان کی مہارت کا شہرہ دور تک پھیلا ہوا تھا، بغداد جو اس وقت علماء و فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا امام غزالی نے وہاں کا قصد کیا اور مدرسہ نظامیہ کے مدرس اعلیٰ مقرر کیے گئے۔

امام غزالی کو دولت علم کے ساتھ شہرت اور اثر و رسوخ کی دولت بھی افراط کے ساتھ ملی، خلیفہ کے دربار میں بھی ان کی بڑی عزت تھی اور عالم اسلام میں اقتدار کے دوسرے مرکز سلجوقی دربار میں بھی ان کا نہایت احترام کیا جاتا تھا، مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری تھا، ان میں سے اکثر مواعظ قلم بند کیے جاتے رہے اور کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوتے رہے، امام غزالی نے خود ان مواعظ کی تعداد تین سو لکھی ہے۔ وعظ و ارشاد کے علاوہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری تھا، امام غزالی کی اکثر کتابیں بغداد کے قیام میں ہی تصنیف ہوئیں۔

امام غزالی ان گوناگوں علمی و دینی ذمہ داریوں کے ساتھ سیاسی اور انتظامی ذمہ داریاں بھی اٹھاتے رہے۔ شاہان سلجوق سے بھی ان کے اچھے روابط تھے اور دربار خلافت میں بھی ان کی بڑی قدر تھی، خلیفہ مستظہر باللہ نے تو ان سے کہہ کر ایک کتاب لکھوائی اور امام غزالی نے اس کا نام ہی خلیفہ کے نام پر المستظہری رکھا، اسی طرح ملک شاہ سلجوقی کی وفات کے بعد ترکان خاتون نے عباسی خلیفہ کا خطبہ بند کرا دیا، کافی رد و کد کے بعد بھی جب یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا تو آخر امام غزالی سفیر بن کر گئے، ترکان خاتون کو نصیحت کی اور بحسن وخوبی اس مسئلہ کو حل کر دیا۔

بغداد میں امام غزالی دولت وشہرت، مقام ومرتبہ کی اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جس کی کوئی بھی شخص تمنا کر سکتا ہے، امام غزالی کا مقام وزراء اور رؤسا سے زیادہ تھا، اہل علم ان کی بے حد توقیر کرتے تھے اور عوام الناس کے لیے وہ مرکز ارشاد و تلقین تھے، غرض

مذہبی سیادت اور دنیاوی جاہ ومنصب سب ان کو حاصل تھا، انہوں نے عظمت ورفعت کی ان بلندیوں کو اچانک خیر باد کہہ دیا اور گوشہ گمنامی میں جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، یہ امام صاحب کی زندگی کا عجیب وغریب واقعہ ہے، اوراس واقعہ نے ہی درحقیقت ان کی زندگی کا رخ اس طرف پھیرا جہاں سے ایک نئے امام غزالی کا طلوع ہوتا ہے۔

وہ تمام دنیاوی علائق کو ترک کر کے اور کامل یکسو ہو کر عبادت وریاضت اور چلہ ومراقبہ میں لگ گئے، بغداد میں رہ کر یہ یکسوئی میسر نہیں آسکتی تھی، اس لیے خاموشی کے ساتھ بغداد کو چھوڑا اور دمشق چلے گئے، جہاں دو سال تک ان کا معمول تھا کہ جامع اموی کے غربی مینار پر چڑھ کر دروازہ بند کر لیتے اور سارا دن ذکر ومراقبہ میں مصروف رہتے، دوسال کی سخت ریاضت ومحنت کے بعد غالباً ان کو یک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا، وہاں سے نکل کر وہ یروشلم گئے، پھر حج کا ارادہ کیا اور حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے، دو سال یہاں قیام رہا پھر مصر اور سکندریہ کا سفر کیا، اور دس سال کی ایک طویل علمی سیاحت کے بعد بغداد پہنچے۔ وہاں تدریسی ذمہ داریاں پھر منتظر تھیں۔ نظام الملک کا انتقال ہو چکا تھا فخر الملک ان کی جگہ وزیر تھے، انہوں نے امام صاحب کو وہی مقام دیا جو ان کے والد نے دیا تھا لیکن جلد ہی محرم الحرام 500ھ میں فخر الملک کو بھی ایک باطنی نے شہید کر دیا، اس کے بعد امام غزالی بھی دوبارہ ہر چیز ترک کر کے طوس یعنی اپنے وطن چلے گئے، جہاں انہوں نے ایک خانقاہ اور ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا اور اس میں درس وتدریس اور وعظ وتذکیر کرتے ہوئے ۱۴؍ جمادی الثانی 505ھ مطابق دسمبر ۱۱۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امام صاحب کی کنیت ابو حامد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کوئی بیٹا ہوگا؛ لیکن کتب تذکرہ میں ان کی صرف چند بیٹیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

معنوی اولاد ان کے تلامذہ ہیں، ان کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہوگی؛ چوں کہ ان کے حلقہ درس میں چار سو طلبہ بیک وقت ہوتے تھے اور انہوں نے ایک طویل عرصہ تک تدریس کے فرائض انجام دیے، کتب تذکرہ میں ان کے چند ممتاز تلامذہ کے نام ملتے ہیں جن میں ایک نام احمد بن تومرت ہے۔ جس نے اسپین میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔

امام غزالی کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں، انہوں نے صرف 54 سال کی عمر پائی، اس میں بھی دس سال وہ سیر وسیاحت میں رہے اس دوران صرف ایک کتاب لکھی اور آخر کے پانچ سال بھی انہوں نے عزلت گزینی میں بسر کیے، اس طرح اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انہوں نے بیس سال کی عمر میں تصنیف وتالیف کا آغاز کیا تھا تو گویا یہ سارا کارنامہ صرف 30 سال میں مکمل کیا۔

ان کی مصروف ترین زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد اور بھی بعید از قیاس لگتی ہے پھر تصنیفات میں تنوع بہت ہے، قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، تصوف اور حکمت شریعت کے علاوہ، فلسفہ، رد فلسفہ، منطق اور عقلی علوم پر انہوں نے بصیرت افروز کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی وہ تصنیفات جن کا شہرہ اور جن کی افادیت آج بھی مسلم ہے، درج ذیل ہیں۔

احیاء علوم الدین ان کی سب سے مشہور کتاب ہے، یہ کتاب حکمت شریعت میں ہے، اس میں امام صاحب نے فلسفہ ومذہب کو باہم آمیز کر کے اسلامی عقائد کو عقلی استدلال اور مذہبی رسوم کو زندہ عملی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ایک ہزار سال گزرنے کے بعد بھی یہ عالم اسلام کی چند منتخب کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

تہافۃ الفلاسفہ، امام غزالی کی دوسری مقبول ترین کتاب ہے، اس کتاب میں انہوں نے فلاسفہ کے بنیادی مسلمات اور ان کی حقیقت کا جائزہ لیا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک اہم کتاب معیار العلم بھی ہے، یہ کتاب دراصل فلاسفہ کے ذرائع علم کا تنقیدی جائزہ ہے۔

کیمیاء سعادت بھی امام غزالی کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب تصوف کی اہم کتاب ہے، اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ امام صاحب نے یہ کتاب اپنی مادری زبان فارسی میں تحریر کی تھی، جب کہ اس کے علاوہ دیگر کتابیں بالعموم عربی میں ہی لکھی ہیں۔

فقہ اور اصول فقہ میں المستصفیٰ اور وسیط، وجیز اور بسیط مشہور ہیں۔ تصوف میں مشکوۃ الانوار، معراج السالکین اور جواہر القرآن مشہور ہیں۔ کلام میں القول الجمیل، تفرقہ بین الاسلام والزندقہ اور الجام مشہور ہیں۔

اور امام غزالی کی فکری سوانح عمری ''المنقذ من الضلال'' باوجود اپنے مختصر حجم کے نہایت معرکہ آراء کتاب ہے، اس کتاب کے بھی مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔

امام غزالی نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ اس وقت کے مروجہ اسلامی معاشرے پر مذہبی نقطۂ نظر سے تنقید کی، معاشرے کی خرابیوں کو بیان کیا، کورانہ تقلید کو نشانہ تنقید بنایا، مذہب کی حقیقت اور اہمیت کو بیان کیا، کلامی موشگافیوں اور فقہی حیلہ کاریوں پر تنقید کی۔

معلومات کی جانچ

1. جنید بغدادی کو خراز کیوں کہا جاتا ہے؟
2. جنید بغدادی کا انتقال کب ہوا؟
3. کس صوفی کو شیخ اکبر کہا جاتا ہے؟
4. فصوص الحکم کس کی تصنیف ہے؟
5. سلسلہ سہروردیہ کا بانی کون ہے؟
6. کس کتاب کو امام غزالی کا شاہکار کہا جاتا ہے؟

21.15 شیخ عبدالقادر جیلانی (1077-1166ء)

حضرت خواجہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جو عوام میں غوث پاک یا بڑے پیر صاحب کے نام سے معروف ہیں، علم و حکمت، شریعت و طریقت اور سلوک و معرفت کے امام تھے، تصوف کے چار مشہور سلسلوں میں سے سلسلہ عالیہ قادریہ کے بانی تھے، برصغیر ہند و پاک اور عالم عرب میں عراق و شام کے عوام پر آپ کے زبردست اثرات رہے ہیں، آپ کی ذات بابرکت کے فیضان سے ہزاروں لوگوں کو سلوک کے منازل طے کرنے میں مدد ملی اور لاکھوں لوگوں نے آپ کے فیضان سے راہ انابت اختیار کی، آپ کی ذات گرامی کا فیضان وقت کی ہر رفتار کے ساتھ وسعت اور عظمت حاصل کرتا رہا اور آپ کے ذریعہ جاری کردہ سلسلہ قادریہ کے حلقہ اثر میں آکر بلاد و امصار کے لوگ توبہ اور انابت کے راستہ پر گامزن ہوتے رہے۔

5.1 مقصد

اس اکائی میں بتایا جائے گا کہ مسلم مفکرین: غزالی ، ابن خلدون ، شاہ ولی اللہ اور علی شریعتی کے سماجی نظریات کیا ہیں؟ انھوں نے انسانی سماج کی تشکیل اور ارتقا کے سلسلے میں کیا تصورات پیش کیے؟ اور ان تصورات کے جدید ماہرینِ سماجیات پر کیا اثرات پڑے؟

5.2 تمہید

مسلم مفکرین میں امام غزالی ، علامہ ابن خلدون ، شاہ ولی اللہ دہلوی اور ڈاکٹر علی شریعتی کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان حضرات نے اسلامی علوم کے مختلف پہلوؤں پر علمی سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے اور فکرِ اسلامی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ خاص بات یہ کہ سماجیات کے میدان میں ان حضرات نے جو افکار و نظریات پیش کیے ہیں ان کی اہمیت محسوس کی گئی ہے اور جدید ماہرینِ سماجیات نے ان کی تائید کی ہے۔

5.3 امام غزالی کے سماجی نظریات

5.3.1 (الف) امام غزالی۔ مختصر حالاتِ زندگی

امام غزالی کا نام محمد، لقب حجۃ الاسلام اور عرف غزّالی تھا۔ ان کے باپ اور دادا کا نام بھی محمد تھا۔ وہ خراسان کے ضلع طوس کے ایک گاؤں طابران میں 450ھ/ 1058ء میں پیدا ہوئے اور وہیں 505ھ/ 1111ء میں وفات پائی۔

ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد غزالی نے نیشاپور کا سفر کیا اور وہاں امام الحرمین جوینی (م 478ھ/ 1085ء) کی شاگردی اختیار کی۔ جب تک امام الحرمین زندہ رہے غزالی ان کی صحبت سے الگ نہ ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد وہ نظام الملک کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ نظام الملک نے انھیں مدرسہ نظامیہ بغداد کے مسندِ درس پر بٹھا دیا۔ تقریباً دس سال انھوں نے وہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، پھر ان کا میلان تصوف اور مجاہدہ و ریاضت کی طرف ہو گیا۔ چنانچہ بغداد سے نکل کھڑے ہوئے اور دمشق ، بیت المقدس، حرمین، اسکندریہ اور دوسرے شہروں میں پھرتے رہے۔ 499ھ/ 1105ء میں کچھ مدت کے لیے پھر مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ آخرِ عمر میں عہدۂ تدریس سے کنارہ کشی کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی۔ گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور خلق خدا کو فیض پہنچاتے رہے۔

امام غزالی کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ یہ تصانیف فقہ و اصول فقہ، منطق و فلسفہ، علم کلام اور تصوف و اخلاق کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں مقاصد الفلاسفۃ ، تھافت الفلاسفۃ ، المستظہری ، فضائح الباطنیۃ ، التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ ، احیاء علوم الدین ، کیمیائے سعادت ، جواہر القرآن ، التبر المسبوک المعروف بہ نصیحۃ الملوک اور مشکوٰۃ الانوار شہرت رکھتی ہیں۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad-34. IMC LIBRARY

5.3.2 سماجی نظریات

امام غزالی کے سماجی نظریات خاص طور پر ان کی تصانیف احیاء علوم الدین اور التبر المسبوک المعروف بہ نصیحۃ الملوک میں ملتے ہیں۔

احیاء علوم الدین چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں عقائد وعبادات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری جلد عادات پر ہے۔ اس میں زندگی کے ہر شعبے کے مختلف کاموں کے آداب سکھایے گئے ہیں۔ تیسری جلد میں مُہلکات سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں فطرتِ انسانی اور معاشرت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد میں مُنجّیات زیر بحث آیے ہیں اور اخلاقیات کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ التبر المسبوک میں ملک شاہ سلجوق کے بیٹے غیاث الدین ابوشجاع محمد کو امورِ مملکت کی انجام دہی کے سلسلے میں زرّیں مشورے دیے گئے ہیں۔

امام غزالی کے نزدیک انسانی زندگی کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں: غذا، لباس، مکان اور باہمی تعلقات۔ ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر غذا کے لیے زراعت، لباس کے لیے کپڑا بننے کی صنعت، مکان کے لیے فنِ تعمیر اور باہمی تعلقات کے لیے سیاست ضروری ہے۔

غزالی پہلے مسلم مفکر ہیں جنھوں نے اجتماع کو فطرتِ انسانی کا تقاضا قرار دیا ہے۔ وہ ارسطو کی طرح انسان کے مدنی الطبع ہونے کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا، بلکہ وہ اجتماع کا محتاج ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: اول نسلِ انسانی کا تسلسل، جو مرد وعورت کی یکجائی اور جنسی تعلق کے بغیر ممکن نہیں، دوم: اسبابِ زندگی کی فراہمی اور تربیتِ اولاد۔ پہلے سبب کا لازمی نتیجہ بچوں کی پیدائش ہے۔ پھر ان بچوں کی پرورش وپرداخت کے لیے مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بغیر خاص توجہ کے ان کی پرورش ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن ایک ہی شخص اولاد کی تربیت، ان کی حفاظت اور ان کے لیے سامانِ غذا فراہم نہیں کرسکتا، چنانچہ خاندان وجود میں آتے ہیں۔ پھر ایک خاندان کا یکہ وتنہا زندگی گزارنا بھی ممکن نہیں، اس لیے ایک جماعت کی ضرورت پڑتی ہے، جس میں مختلف افراد الگ الگ صنعت اختیار کریں۔ مثلاً ایک شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ تنہا زراعت کرے، کیوں کہ زراعت کے لیے آلات درکار ہوتے ہیں اور آلات کے لیے لوہار اور بڑھئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر غذا کے لیے پیسنے والا اور کھانا پکانے والا ضروری ہے۔ اسی طرح لباس بھی ایک شخص نہیں تیار کرسکتا۔ اس کے لیے اول روئی کی زراعت ضروری ہے۔ پھر کاتنے اور بننے کے آلات کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر ان کپڑوں کو سینے والے کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ الغرض انسان کا تنہا زندگی گزارنا دشوار ہے اور بغیر اجتماع کے وہ ضروریاتِ زندگی نہیں فراہم کرسکتا۔ پھر یہ انسانی جماعت کھلے میدان میں رہے تو گرمی، سردی اور بارش سے اسے ناقابلِ برداشت تکالیف اٹھانی پڑے اور چوروں کا بھی خطرہ رہے گا، اس لیے ضروری ہوا کہ مضبوط مکانات تعمیر کیے جائیں اور ایک ایک خاندان الگ الگ اپنے سازوسامان کے ساتھ رہے۔ اس طرح شہر وجود میں آئے۔

غزالی مزید کہتے ہیں کہ جب شہروں میں لوگ اکھٹے رہتے ہیں تو ان کے باہمی معاملات میں اکثر نزاع سر ابھارتی ہے۔ شوہر بیوی، باپ بیٹے، بھائی بھائی میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ لوگ آپس میں لین دین کرتے ہیں تو ان کے درمیان تنازعات ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ باہمی نزاع پر قابو پانے کے لیے مختلف ادارے، مثلاً سپاہ گری، پنچایت، عدلیہ اور حکومت وغیرہ وجود میں آئے۔ ساتھ ہی ایسے لائق اور قابل افراد کی ضرورت ہوتی ہے، جو ان فنون میں مہارت رکھتے ہوں۔ ان لائق اور قابل افراد کے انتخاب اور تقرر کے لیے ایک فرد کی ضرورت ہوتی ہے، جو امام یا خلیفہ کہلاتا ہے۔

امام غزالی نے پیشے کے لحاظ سے انسانوں کے تین طبقات قرار دیے ہیں۔ پہلا طبقہ کاشت کاروں، چرواہوں اور اہلِ صنعت وحرفت کا ہے۔ دوسرے طبقے میں فوجی شامل ہیں۔ تیسرا طبقہ اہلِ علم واہلِ قلم حضرات کا ہے۔ غزالی کہتے ہیں کہ اہل قلم پہلے دو طبقوں میں ربط قائم کرتے ہیں، اس لیے وہ ان دونوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

5.4 ابن خلدون کے سماجی نظریات

5.4.1 ابن خلدون۔مختصر حالاتِ زندگی

ابن خلدون کا نام عبدالرحمٰن، کنیت ابوزید اور لقب ولی الدین تھا۔ ان کی ولادت 732ھ/ 1332ء میں تیونس (افریقہ) میں اور وفات 808ھ/ 1406ء میں قاہرہ میں ہوئی۔ ابتدائی عمر میں انھوں نے قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد نحو، لغت، فقہ، حدیث، شعروشاعری، منطق، فلسفہ، علم کلام، عربی زبان وادب اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ مختلف حکم رانوں کے درباروں سے وابستہ ہوئے اور معزول ہوتے رہے۔ جامع ازہر مصر میں کچھ عرصہ درس دیا۔ سلطان ظاہر نے انھیں قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا۔ اپنی چوہتّر سالہ زندگی میں انھوں نے یورپ، افریقہ اور ایشیا کے متعدد ممالک کی سیر کی اور وہاں کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔

ابن خلدون نے منطق، ادب، ریاضی اور دیگر علوم میں متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، لیکن وہ حوادثِ زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ البتہ ان کی شہرہ آفاق تصنیف 'کتاب العبر' موجود ہے، جو تاریخ ابنِ خلدون کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب المغرب، عرب اور بربر قبائل کے بارے میں ازمنۂ وسطی کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے اور پچاس سال کے براہ راست مشاہدے اور متعدد کتابوں، وقائع اور اپنے زمانے کی سفارتی اور سرکاری دستاویزوں کے گہرے مطالعے کا ثمرہ ہے۔ ابن خلدون نے اس کتاب کا ایک مبسوط مقدمہ لکھا تھا، جو 'المقدمۃ' کے نام سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ المقدمۃ میں تمام علوم اور تہذیب کے جملہ شعبوں سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے خیالات کی گہرائی، وضاحتِ بیان اور اصابتِ رائے کے لحاظ سے اس کتاب کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ المقدمۃ میں ابن خلدون نے انسانی سماج کی تشکیل اور ارتقا سے متعلق متعدد بحثیں کی ہیں، جو بڑی قدر وقیمت کی حامل ہیں۔

5.4.2 سماجی نظریات

ابن خلدون مسلم اصحابِ علم میں پہلا شخص ہے، جس نے عمرانیات کی واضح بنیادیں قائم کیں۔ اس کی تصنیف 'المقدمۃ'، جس سے اسے عالمی سطح پر شہرتِ دوام حاصل ہوئی، فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر ہے، اس میں عمرانیات کی بحثیں ضمناً آ گئی ہیں۔ فلسفۂ تاریخ

جھوٹ: جھوٹ تین رذائل سے مرکب ہے: ظلم، بزدلی اور جہالت۔ یہ لفظ عام ہے اور حقائق کے ہر طرح کے انکار کو شامل ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا، وہ بھی جھوٹا ہے، جس نے حقیقت کے برخلاف کسی کو کوئی خبر دی، وہ بھی جھوٹا ہے اور جس نے ایسا کام کیا، جو غیر ضروری تھا، وہ بھی جھوٹا ہے۔ وہ کہتے ہیں جھوٹ سے زیادہ بری کوئی اور چیز نہیں ہے اور کفر اسی کی ایک قسم ہے۔ تاہم جھوٹ کی ان تمام تر قباحتوں کے باوجود نیک اور خیر کے مقصد کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اور اس کے جائز ہونے کی چار صورتیں ہیں:

(1) بیوی کی اصلاح یا ازدواجی زندگی کو ٹوٹ پھوٹ اور انتشار سے بچانے کے لیے شوہر کا جھوٹ بولنا۔

(2) کسی ظالم بادشاہ یا حکومت کے ظلم سے کسی مظلوم کو بچانے کے لیے جھوٹ بولنا۔

(3) جنگ میں جھوٹ بولنا کہ اس سے اہلِ شر و بغاوت کا فتنہ ختم ہو۔

(4) لوگوں کے باہمی تعلقات میں پیدا ہونے والی دراڑ کو ختم کرنے کے لیے جھوٹ بولنا۔

ابنِ حزم کی نظر میں رذائل کو اختیار کر لینے کی ایک بڑی بنیاد عقل کو درکنار کر کے تقلید کی روش اختیار کر لینا ہے۔ اور تقلید اس کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی کی بات کو بغیر کسی قطعی دلیل (برہان) کے قبول کر لے۔ تقلید ان کی نظر میں عقل کے انکار کے مترادف ہے۔

18.3.1 امتیازات و خصوصیات

ابن حزم کا تصور اخلاق نہایت وسعت و جامعیت کا حامل ہے۔ علمائے اسلام میں غزالی کی طرح وہ اس کے تقریباً تمام ضروری عناصر سے بحث کرتے ہیں۔ ان کے تصورِ اخلاق کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ عقل کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ اور عقلی رویے کے مقابلے میں تقلیدی رویے کو وہ بہت سی خرابیوں کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔ ابنِ حزم کی نظر میں کوئی ایک غرض و غایت جو تمام لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ اور ان کو متحرک رکھنے والی ہو، وہ خود کو غم والم سے بچانا (طرد الھم) ہے۔

عام طور پر لوگوں نے اخلاق کا مقصد ''حصول سعادت'' بتایا ہے، لیکن ابن حزم نے اس کی جگہ انتہائی جامع اور وسیع المعنیٰ تعبیر ''طرد الہم'' (اپنے آپ کو غم سے محفوظ رکھنا) اختیار کی ہے اور اس کو اخلاق کا بنیادی مقصد قرار دیا ہے؛ گویا ابن حزم لوگوں کے خود کو غم سے بچانے کے مقصد کو ان کی نظر میں سعادت کے بالمقابل تصور کرتے ہیں جس کو اخلاق کی غرض و غایت کے طور پر یونانی فلسفیوں کے یہاں بھی مقبولیت حاصل رہی ہے اور بہت سے مسلم علما و مفکرین بھی اخلاق کی غرض و غایت کو اسی لفظ سے تعبیر کرتے رہے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ: ''میں نے ایک ایسے مقصد کو تلاش کرنے کی کوشش کی، جس کو تمام لوگ بہتر سمجھتے ہوں اور اس کے حصول کے خواہاں ہوں تو مجھے جو چیز نظر آئی وہ خود کو غم سے دور رکھنا ہے۔'' (الاخلاق والسیر، ص 2-3)

18.4 غزالی کا نظریہ اخلاق

ابو حامد الغزالی (م: 1111) بیک وقت ایک بڑے اسلامی فلسفی، مفکر، فقیہ اور صوفی تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی نہایت اہم علمی تصنیفات اسلامی کتب خانوں کی زینت ہیں۔ اسلامی فکر پر ان کی فکر کے نہایت گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ غزالی کی تصنیفات میں احیاء علوم الدین، تہافۃ الفلاسفۃ اور المستصفی وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اخلاق کے موضوع پر انہوں نے مختلف کتب و رسائل میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے لیکن ان میں احیاء علوم الدین سر فہرست ہے جس کو مختصر طور احیاء العلوم سے جانا جاتا ہے۔

غزالی کے اخلاقی نظریات وافکاراور اس موضوع پر ان کے کام کی نوعیت واہمیت کے صحیح فہم کے لیے اس کے زمانی و مکانی پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، جس میں غزالی نے آنکھیں کھولیں اور اپنی علمی وفکری تشکیل کا سفر طے کیا، حقیقت یہ ہے کہ غزالی کے عہد اور ماحول میں سیاسی بے چینی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے درمیان فکری انتشار اور اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ فکری انتشار کی وجہ سے اسلام کی مسلمہ فکر سے متصادم اور منحرف فکر رکھنے والے فرقے اور بھانت بھانت کی جماعتیں پیدا ہو رہی تھیں اور انھیں فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اسلامی علوم کی اشاعت میں مصروف علماء وفقہاء اور اصلاح وتزکیہ کے مدعی صوفیہ واہل طریقت کے درمیان افسوس ناک اخلاقی کمزوریاں اور عیوب پھیلے ہوئے تھے۔ عام لوگوں کی حالت تو ظاہر ہے مزید بدتر تھی کہ ان کی اصلاح ورہنمائی پر مامور طبقہ خود محتاج اصلاح وتزکیہ تھا۔ غزالی نے احیاء العلوم میں متعدد مقامات پر اس طبقے کی غیر اخلاقی روشوں کا تذکرہ کیا ہے، اور اس پر شدت کے ساتھ نکیر کی ہے۔

اخلاق کی حقیقت:

غزالی نے احیاء العلوم میں اس نکتے پر روشنی ڈالنے کے بعد کہ اخلاق انسان کی باطنی کیفیت کا نام ہے، اخلاق کی یہ تعریف کی ہے: ''اخلاق نفس انسانی میں پائی جانے والی ایسی راسخ کیفیت کا نام ہے، جس سے بے تکلف اور کسی پیشگی غور وفکر کے بغیر افعال سرزد ہوں''۔ اس کی وضاحت وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ اگر یہ راسخ صورت یا ملکہ اس نہج پر ہو کہ اس سے عقلی وشرعی طور پر اچھے اور خوب صورت افعال صادر ہوں تو انھیں ''خلق حسن'' کہا جاتا ہے، اور اگر ایسے نہج پر ہو کہ اس سے برے اخلاق صادر ہوں تو انھیں ''خلق سیئ'' (برا اخلاق) کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم نے راسخ صورت کی قید اس لیے لگائی ہے کہ، مثال کے طور پر، کوئی شخص کسی عارضی سبب یا حاجت سے سخاوت پسندی کا اظہار کرتا ہے تو ایسے شخص کو سخی نہیں کہا جاسکتا، اسی طرح جس شخص کو کسی ناگوار واقعے پر مصلحت کا خیال کرتے ہوئے حلیم و نرم مزاج بننا پڑتا ہے، تو ایسے شخص کو حلم اور نرم مزاجی کی صفت رکھنے والا نہیں سمجھا جاسکتا۔ غزالی کی نظر میں اخلاق کی غرض اور اس کا مقصود حقیقی سعادت ومسرت کا حصول ہے اور حقیقی سعادت ومسرت کا تعلق اصلاً آخرت سے ہے؛ اس لیے کہ ان سے بقول: ''آخرت کی سعادت ایسی بقا کا نام ہے جس کو فنا نہیں، ایسی لذت کا نام ہے جس میں کوئی مشقت نہیں، ایسی خوشی ہے جو غم سے محفوظ ہے، ایسی دولت مندی ہے جو فقر وغربت سے خالی ہے، ایسا کمال ہے جو نقص سے پاک ہے، ایسی عزت ہے جس میں ذرہ برابر بھی ذلت نہیں۔ مجموعی طور پر وہ ایسی چیز کا نام ہے جو ہر فرد کا مطلوب ومقصود ہے۔ اسی کے ساتھ اہم بات یہ ہے کہ یہ خوشی ہمیشہ رہنے والی ہے، کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے''۔

لیکن اس کا مطلب غزالی کے نزدیک ہرگز یہ نہیں ہے کہ دنیوی سعادت اخلاق کے مقاصد میں شامل نہیں ہے، بلکہ وہ بھی مقصود ہے، جو بھی چیز آخرت کی سعادت سے قریب کرنے والی ہو، انھیں بھی سعادت اور خیر کا نام دیا جاسکتا ہے، لیکن سعادت کا حقیقی اطلاق دراصل سعادت اخروی پر ہی ہوتا ہے۔ غزالی کی نظر میں دنیوی خیر اور بھلائی کو حاصل کرنے کے تین محرکات ہیں: نفسیاتی: (1) جس کا تعلق زمانہ حال یا آئندہ میں پیش آسکنے والے واقعات کی طرف رغبت یا ان سے خوف کھانے سے ہے۔ (2) اجتماعی: دوسروں کی طرف سے تعریف وستائش کی امید یا ان کی طرف سے برائی اور مذمت کا خوف (3) عقلی: فضیلت اور کمال نفس کی طلب اور خواہش صرف اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ میں فضیلت اور کمال ہیں۔

غزالی کے نزدیک اخلاقی فعل کی چار شرطیں ہیں۔(1) اچھے یا برے فعل کا پایا جانا (2) انسان کا ان دونوں نوع کے افعال پر بیک وقت قادر ہونا (3) جو کام وہ کر رہا ہے، اس کی حقیقت اور فائدے سے واقف ہونا (4) اور آخری سب سے اہم شرط یہ ہے کہ یہ فعل فاعل سے اپنے آپ وجود میں آئے، خواہ وہ فعل اچھا ہو یا برا۔ نفس پر زور ڈالنے یا اس کو اس پر مجبور کرنے کے عمل کا اس میں دخل نہ ہو۔ ان کے نزدیک حسن اخلاق کے ارکان بھی چار ہیں جن میں تناسب اور توازن واعتدال سے حسن اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے، ان کی حقیقت ویسی ہی ہے جیسے انسان کے ظاہری حسن میں ناک، کان اور آنکھ وغیرہ کی، جس طرح ان کے بغیر حسن ظاہر کا تصور ممکن نہیں، اسی طرح ان چاروں ارکان کی موجودگی کے بغیر حسن اخلاق کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ چار ارکان ہیں: قوت علم، قوت غضب، قوت شہوت اور قوت عدل۔ قوت عدل ان تینوں قوتوں کے درمیان اعتدال پیدا کرنے والی قوت ہے۔ دراصل ان ہی قوتوں کے اعتدال کا نام حسن خلق ہے، اگر یہ تینوں بنیادی ارکان کسی شخص کے اندر اعتدال کے ساتھ موجود نہ ہوں، ان میں افراط وتفریط پائی جاتی ہو تو ایسے شخص کو حسن اخلاق کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قوت علم جس کا فکر وعمل کی قوت پر بھی اطلاق ہوتا ہے، سے حکمت پیدا ہوتی ہے، جو حسن خلق کی اساس اور بنیاد ہے، اس سے حق و باطل، کھرے اور کھوٹے میں تمیز پیدا ہوتی ہے، قوت غضب میں اعتدال سے شجاعت پیدا ہوتی ہے، جس کے مختلف مظاہر میں خودداری، دلیری اور استقلال وثبات قدمی شامل ہے، قوت شہوت سے جب کہ وہ عقل وشرع اور حکمت کے تابع ہو، عفت پیدا ہوتی ہے، جس کا ثمرہ حیا، صبر، درگزر اور قناعت وغیرہ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

غزالی نے یوسف بن اسباط سے حسن خلق کی دس علامتیں نقل کی ہیں:

> ''اختلاف میں زیادہ نہ پڑنا، اعتدال کی راہ اختیار کرنا، دوسروں کی غلطیوں کی جستجو میں نہ رہنا، برائیوں کی اصلاح کرنا، معذرت طلبی، تکلیف دہ چیزوں کو برداشت کرنا، نفس کو زجر وتوبیخ کرنا، صرف اپنے عیوب پر نگاہ رکھنا، ہر چھوٹے بڑے سے کشادہ پیشانی سے ملنا اور ہر کم یا زیادہ رتبہ رکھنے والے افراد سے نرم گفتگو کرنا۔''

اخلاق میں تغیر اور اس کی اصلاح:

اخلاق کے حوالے سے یہ بحث رہی ہے کہ اس میں تبدیلی اور اصلاح کا امکان ہے یا نہیں؟ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' میں مختلف اصحاب علم کے نقطہائے نظر کا ذکر کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاق طبعی اور جبلی ہوتے ہیں؛ اس لیے ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، جب کہ دوسرے لوگوں کی رائے میں اخلاق طبعی یا جبلی نہیں ہوتے؛ لیکن ہم اسے غیر طبعی بھی نہیں کہہ سکتے؛ اس لیے کہ طبعی طور پر ہمارے اندر اخلاق کو قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، بلکہ نصیحت، ڈانٹ پھٹکار یا سزا کے ذریعے ہم جلد یا دیر سے بُرے اخلاق کو ترک کر کے اچھے اخلاق کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام غزالی نے ارسطو کی اتباع کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تربیت اور مشق سے اخلاق میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر اس اصول کو قبول نہ کیا جائے کہ حالات وواقعات کے مطابق اخلاق پر اچھے یا برے عوامل کا اثر مرتب ہوتا ہے تو رسول ﷺ کے اس

فرمان کہ اپنے اخلاق کو سنوارو، کا باطل ہونا لازم آئے گا اور وعظ ونصیحت اور کسی چیز کے برے انجام سے ڈرانے یا اچھے انجام کی ترغیب کے ذریعے لوگوں کی اصلاح سے تعلق رکھنے والے سارے نظریات اور کوششوں کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہ جائے گا۔ یہ ایک دیکھی سمجھی جانے والی حقیقت ہے کہ وحشی جانوروں یا پرندوں کو ان کی عادت کے برخلاف سدھایا جاتا ہے، چنانچہ ان کی طبیعت میں پائی جانے والی وحشت یعنی جنگلی پن جاتا رہتا ہے، پھر انسانی اخلاق میں تبدیلی واصلاح آخر کیوں نہیں ہوسکتی؟ ظاہر ہے عقل کی قوت رکھنے کی وجہ سے انسان کے مزاج میں تبدیلی کی توقع زیادہ بہتر طور پر کی جاسکتی ہے۔

اخلاق کی اصلاح وتعمیر کے تعلق سے غزالی لوگوں کی چار قسمیں قرار دیتے ہیں:

(1) غفلت میں پڑے ہوئے لوگ، جو حق وباطل اور حُسن وقبیح (بہتر اور برے) میں تمیز کرنا نہیں جانتے اور ان کا ذہن سادہ طور پر اپنی فطرت پر قائم اور اس تعلق سے کسی بھی قسم کے نظریے اور تصور سے خالی ہوتا ہے، ان کے اخلاق کی اصلاح آسانی کے ساتھ اور کم وقتوں میں ممکن ہے۔

(2) دوسری قسم ان افراد کی ہے جنھوں نے اچھے اور برے عمل کا فرق تو ضرور سمجھ لیا ہو لیکن ان پر، خواہش نفس کا غلبہ ہو، تاہم انھیں اپنی کمی کا کسی درجے میں احساس بھی ہو، ایسے لوگوں کی تاخیر ہی سے سہی محنت وریاضت کی بنیاد پر اصلاح ممکن ہے۔

(3) تیسرے زمرے میں ایسے لوگ آتے ہیں جو بداخلاقی کو ہی ضروری اور بہتر تصور کرتے ہوں، اسی بنیاد پر ان کی پرورش وپرداخت ہوئی ہو، ایسے لوگوں کی اصلاح کی امید مشکل سے کی جاسکتی ہے۔

(4) چوتھی قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی پرورش اور ذہن کی تشکیل کسی باضابطہ نظریے کی اساس پر ہوئی ہو، بچپن سے وہ اسی پر عامل ہوں۔ شر نے ان کی نظر میں مطلق طور پر خیر کی شکل اختیار کرلی ہو اور وہ اس پر فخر کرنے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کی صلاح کا معاملہ سب سے زیادہ مشکل ہے۔

ریاضت کے ذریعہ اخلاق کی اصلاح:

قرآن سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے، دونوں صلاحیتیں اس کے اندر رکھی گئی ہیں اور یہی دراصل اس کی آزمائش کی بنیاد ہے، انسان سے یہ مطلوب نہیں ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اس کے اندر سے شر کا مادہ بالکل ختم ہو جائے، مطلوب صرف اس مادے کو دبا دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں غصّے کو دبانے کی بات کی گئی ہے، خاتمے کی بات نہیں کہی گئی ہے (آل عمران: 124) غزالی نے اخلاق بد کی اصلاح کے طریقوں پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نظر میں اخلاق بد کی اصلاح کے لیے جسمانی صحت کے اصولوں کے طرز پر علاج بالمضاد (کسی کیفیت کا اس کی برعکس کیفیت سے علاج) کے اصول کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے، یعنی اگر جسم کا اعتدال گرمی سے ختم ہوگیا ہے تو اس کا علاج سردی سے یا اس کے برعکس صورت میں سردی کا علاج گرمی سے کیا جائے گا، اس طرح روح یا اخلاق کے امراض کے علاج کی کوشش کی جائے گی، مثال کے طور پر جہالت کا علاج تعلیم سے اور بخل کا علاج سخاوت پسندی کی تربیت اور اس میں مشغولیت کے ذریعہ کیا جائے گا۔ غزالی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خود کو خوب صورت اخلاق یعنی اخلاق جمیلہ کا پابند اور عادی بنانے کے لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ابتدا میں اپنے نفس کو زبردستی اس پر مائل کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا کرنے کی صورت میں آگے چل کر یہی چیز اس کے مزاج کا حصہ بن جائے گی۔

غزالی نے فلسفہ اخلاق کی تشکیل میں جو رول ادا کیا ہے، وہ بے نظیر ہے۔ غزالی سے قبل علم اخلاق یا تو بے روح یونانی فلسفے کا مجموعہ تھا یا پھر فلسفہ وحکمت سے خالی صوفیانہ پند وموعظت کا نمونہ۔ غزالی نے ان دونوں کے درمیان تطبیق دینے اور ان کی خصوصیات کو جمع کرنے کی کوشش کی؛ لیکن اس سے بڑا ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نظریہ اخلاق کو جامعیت اور وسعت عطا کی، اس میں بیش بہا اضافہ کیا۔ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ انھوں نے نفس فن کو اس قدر وسعت دی کہ یونانیوں کا فلسفہ اخلاق اس کے مقابلے میں قطرہ ودریا کی نسبت رکھتا ہے۔

غزالی نے اسلامی نظریہ اخلاق کو جن وسعتوں اور گہرائیوں سے آشنا کیا اور اسے جو بلندی عطا کی، اس کی دوسری مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ غزالی کا نظریہ اخلاق مجموعی طور پر انسانی عقل وفطرت سے قریب اور اسلامی حکمت وشریعت سے ہم آہنگ ہے۔

18.4.1 امتیازات وخصوصیات

غزالی کے نظریہ اخلاق کی سب سے بڑی خوبی اس کی جامعیت ووسعت ہے۔ غزالی سے قبل کسی مسلم مفکر نے اخلاق کا اتنا جامع اور ہمہ گیر نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ غزالی کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اخلاق کے مسائل کو محض فلسفہ یا دین کے آئنے میں دیکھنے کی بجائے انہیں ان دونوں سے تشکیل پائے ہوئے فکری معیار کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی اور صوفیانہ احوال ومشاہدات کی روشنی میں اپنے نظریات کو آگے بڑھانے اور فکری نتائج اخذ کرنے کو اپنا مقصود بنایا۔ شبلی نعمانی کی نظر میں غزالی کے نظریہ اخلاق کے امتیازات میں جو باتیں شامل ہیں، جنھیں انہوں نے اپنی کتاب ''الغزالی'' میں لکھا ہے، ان میں پہلی بات عقل وحکمت اور دینی وعظ ونصیحت دونوں کو ساتھ نبھانا ہے۔ دوسری چیز آسان اور لطیف پیرایۂ بیان۔ تیسری چیز طبیعتوں کے اختلاف کا لحاظ ہے۔ اور چوتھی چیز رسول اللہ ﷺ کے احوال کی نوعیت کی صحیح شناخت ہے کہ ''کون سے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے معاشرت اور عادت کی حیثیت سے؟'' آخری چیز اعتدال ہے۔ حقیقت میں غزالی کا نظریہ اخلاق نہایت جامع ہے۔ انہوں نے اس کے تقریباً تمام ہی پہلوؤں پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ آیات قرآنی، احادیث، آثار صحابہ، صوفیہ اور مشائخ کے منتخب اقوال کو پیش کرنے کے ساتھ، متعلقہ بحثوں کو تفصیلی مثالوں سے آراستہ کیا ہے۔ غزالی کے وقت تک اخلاق کے موضوع پر جو بھی کتابیں لکھی یا ترجمہ کی گئی تھیں، واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ غزالی نے ان سے اچھی طرح استفادہ کیا تھا۔ غزالی کے نظریہ اخلاق میں اس کا خلاصہ بھی نظر آتا ہے۔ اس طرح اخلاق پر لکھنے والے علما میں غزالی کا قد بہت زیادہ بلند ہے۔

معلومات کی جانچ:

1. ابن حزم کا رذائل سے متعلق نظریہ کیا ہے؟
2. غزالی کے نزدیک اخلاق میں تغیر کی حقیقت پر روشنی ڈالیے؟

18.5 ابنِ مسکویہ کا نظریہ اخلاق

ابوعلی احمد بن یعقوب بن مسکویہ جو ابن مسکویہ (وفات: 1064) کے نام سے معروف ہیں، ایک بڑے فلسفی، مؤرخ اور

اخلاقیات داں کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں ان کی کتاب ''تجارب الامم''، فلسفے میں ''الفوز الاصغر'' اور اخلاقیات میں ''تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق'' اہم ہیں۔

ابن مسکویہ وہ پہلا مسلم فلسفی ہے جس نے اخلاقیات کے موضوع کو باضابطہ طور پر اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ اس سے قبل رسائل اخوان الصفا کے مؤلفین نے ایک رسالہ اخلاق پر لکھا تھا، لیکن اس کا انداز واعظانہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سرسری اور غیر منضبط تھا۔ ابنِ مسکویہ کی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' مختلف لحاظ سے اس موضوع پر نہایت جامع کتاب ہے۔ اس نے یونانی فلسفیوں، خاص طور پر افلاطون وارسطو کے اخلاقی نظریات سے استفادہ کیا، بلکہ دراصل ان ہی کے نظریات پر اپنے نظریۂ اخلاق کی بنیاد رکھی۔

ابن مسکویہ نے اخلاق کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے: ''اخلاق نفس کی ایسی حالت کا نام ہے جو نفس کو ایسے افعال کی انجام دہی پر ابھارتی ہو کہ وہ اس سے بے تکلف اور بغیر کسی غور وفکر کے سرزد ہوں۔''

خلق یا اخلاق کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو انسان کے اصل مزاج میں شامل ہو، جیسے: فوراً غصہ میں آجانا (انفعالیت) یا معمولی حرکت سے خوف زدہ ہو جانا، دوسرے: جو ماحول، تعلیم اور تربیت کے زیر اثر اس کے اندر پیدا ہو۔ اخلاق کے حوالے سے یونانی فلسفیوں کے درمیان یہ بحث رہی ہے کہ اخلاق میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ابنِ مسکویہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے، ورنہ عقل وفہم کی قوت کو باطل کرنا اور تعلیم وتربیت کی ضرورت کا بے فائدہ ہونا لازم آئے گا۔ شریعت کا کام یہی ہے کہ وہ انسان کو ترغیب یا خوف دلانے کے ذریعہ فضائل کی طلب اور رذائل سے بچنے پر ابھارتی ہے۔

ابنِ مسکویہ نے اخلاق سے متعلق اپنی بحث نفس یا روح کی حالت کے بیان سے کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روح انسانی جسم اور عرض نہیں ہے بلکہ ایک مستقل جوہر ہے۔ اور اس میں ایسی خصوصی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں جو جانوروں میں نہیں پائی جاتیں۔ انھی کی بنیاد پر انسان تمام جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں ارادہ، تمیز اور غور وفکر سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اس قسم کے انسانی ارادے کے ذریعہ انجام پانے والے افعال اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اور ان کی اچھائی اور برائی کا معیار یہ ہے کہ ہر چیز کی پیدائش کا جو مقصد ہے، یہ افعال ان مقاصد کی تکمیل میں معاون ہوں۔

اس نے گھوڑے اور تلوار کی مثال دی ہے کہ اگر پہلے میں تیز دوڑنے اور دوسرے میں کاٹ ڈالنے کی خوبی نہ ہو تو اس کی حیثیت بہت معمولی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان اگر اپنے مقصدِ پیدائش سے بیگانہ رہ جاتا ہے تو وہ جانوروں کی صفت میں آجاتا ہے۔ لیکن چوں کہ اعمال خیر کثرت سے ہیں اور انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ تمام خیر اور اچھائیوں کو اپنے اندر جمع کر لے، اس لیے ایک ہی زمانے میں ایسی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے، جو اجتماعی کوششوں سے اس مشترکہ سعادت کو حاصل کر سکے۔ اس طرح وہ اجتماعیت اور اجتماعی زندگی کو اپنے نظریۂ اخلاق میں خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ رہبانیت اور دنیا سے گوشہ نشینی اس کی نظر میں اخلاقی فضیلت کی قاتل ہیں۔ اس کی نظر میں انسان کے اندر تین متضاد قوتیں پائی جاتی ہیں، جن کا صحیح اور متوازن استعمال اخلاقی فضائل کے حصول کی بنیاد ہے۔ یہ تین قوتیں ہیں: قوتِ عقل، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت۔ قوت عقل سے انسان اشیا میں غور وفکر کرتا اور حقائق کا پتا لگاتا ہے۔ قوتِ غضب سے بہادری، جرأت ودلیری اور اقتدار وتسلط حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جب کہ قوتِ شہوت سے مادی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پہلی قوت میں اعتدال سے علم وحکمت پیدا ہوتی ہے۔ دوسری

قوت میں اعتدال سے شجاعت اور تیسری قوت میں اعتدال سے عفت پیدا ہوتی ہے۔ پھر ان تینوں قوتوں کے مجموعی توازن و اعتدال سے ایک اور اخلاقی خوبی یا فضیلت پیدا ہوتی ہے جس کا نام ''عدالت'' ہے۔ ابنِ مسکویہ کہتا ہے کہ فلسفیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ فضائل کی یہی چار بنیادی قسمیں ہیں۔ اس لیے اگر کسی شخص کو فخر کا حق حاصل ہے تو انھی چاروں فضائل پر۔'' اس کی نظر میں انسان کی سعادت انھی فضائل کے حصول میں پوشیدہ ہے۔ عدالت پر اس نے زیادہ تفصیل اور گہرائی کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس کی نظر میں عدل کے معنی مساوات کے ہیں۔ اس لیے عادل ایسے شخص کو کہیں گے جو دو ایسی چیزوں میں مساوات پیدا کرے جن میں مساوات نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو ان کے سلسلہ حیا زروی کا ادراک ہوتا کہ وہ اس کے دونوں کناروں کو اس کی طرف لا سکے۔ مثلاً معاملات میں نفع ونقصان دو کنارے ہیں، اگر کوئی شخص حق سے زیادہ لے تو یہ زیادتی ہے اور اگر حق سے کم لے تو یہ نقصان ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا درجہ وسط ہے جس کی تعیین شریعت کرتی ہے۔

ابنِ مسکویہ کی نگاہ میں مذکورہ بالا چار فضائل کے مقابلے میں آٹھ رذائل ہیں۔ ہر فضیلت دو رذائل کے درمیان ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر فضیلت افراط وتفریط پر مبنی دو منفی صفات کی درمیانی صفت کا نام ہے۔ چنانچہ حکمت چال بازی اور حماقت کے بیچ کا درجہ ہے۔ عفت حرص و ہوس اور خواہش کے بالکل نہ ہونے کے درمیان کی صفت کا نام ہے۔ شجاعت بزدلی اور ناعاقبت اندیشانہ اقدام کے درمیان کی راہ ہے اور عدالت ظلم کرنے اور ظلم سہنے کے درمیان کی صفت ہے۔ ان چاروں بنیادی فضائل کے تحت بہت سے ضمنی فضائل آتے ہیں۔ جیسے حکمت کے تحت آنے والے فضائل میں ذکاوت، تعقل وغیرہ ہیں اور عفت کے تحت آنے والے فضائل میں صبر، سخاوت، حریت، قناعت وغیرہ۔ شجاعت کے ضمنی فضائل خودداری، بلند ہمتی، بردباری وغیرہ۔ عدالت کے ضمنی فضائل الفت، صلہ رحمی، شر کا بدلہ خیر سے دینا وغیرہ ہیں۔ اور یہ تمام ضمنی فضائل بھی افراط وتفریط پر مبنی اور رذائل کی درمیانی صفت کا نام ہے۔ جیسے حیا بے شرمی اور ترک دینا اور سخاوت فضول خرچی اور بخل کی درمیانی صفت کا نام ہے۔

اخلاق کی غرض و غایت یونانی فلسفیوں کے نزدیک سعادت کا حصول ہے۔ البتہ سعادت کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن مسکویہ کے نزدیک سعادت کوئی خارجی چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ عقل کی روشنی میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء وتکمیل کا دوسرا نام ہے۔ اسی میں تمام تر خوشی ومسرت پوشیدہ ہے۔ انسانی عقل کا ایک جز علمی اور دوسرا عملی ہے۔ علمی جز کا مقصد حقائق کی معرفت حاصل کرنا ہے اور عملی جز کا مقصد تمام امور میں تنظیم وترتیب پیدا کرنا ہے۔

عقل علمی کو عقل عملی پر ترجیح حاصل ہے۔ بلکہ عقل علمی عقل عملی کی غایت ومقصود ہے۔ ابنِ مسکویہ کے مطابق سعادت اپنی کامل شکل میں صرف چند ہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ تاہم وہ باہمی تعاون، اتحاد واجتماعیت اور جذبۂ انس و ہمدردی کے ذریعہ اس سعادت میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ریاست اس اجتماعی تعاون و ہمدردی کی ایک مکمل شکل ہے۔ فرد کی طرح ریاست کا مقصد بھی سعادت کا حصول ہے اور اس کے لیے فرد اور ریاست دونوں کے لیے خدا کی شریعت کی پابندی ضروری ہے، اس کے بغیر سعادت کا حصول ممکن نہیں۔

18.5.1 امتیازات وخصوصیات

ابنِ مسکویہ کا نظریۂ اخلاق یونانی فلسفے سے متاثر ہے۔ خاص طور پر وہ ارسطو کا خوشہ چیں ہے۔ لیکن وہ تمام تر معاملات میں انحصار نہیں کرتا۔ ارسطو سمیت دوسرے فلسفیوں کے تصورِ اخلاق میں خدا و آخرت کو مرکزی مقام حاصل نہیں ہے، جب کہ ابنِ

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE • MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad-34.